POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 03-04 January 2025, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 86 واں سال

Date of Publication: 02-01-2025 • Price: 5/- • 8-14 January 2025 • Issue: 2 • Vol:84

۸تا۱۴رجنوری ۲۰۲۵ء • شمارہ:۲ • جلد:۸۴

تحقیق کا استدلالی طریقِ کار

مرزا خلیل احمد بیگ

معروف محقق گیان چند جین (1923-2007) نے اپنی عالمانہ تصنیف 'تحقیق کا فن' کا انتساب اِن الفاظ میں کیا ہے:

'ان تحقیق کاروں کے نام جو خالص محقق نہیں ہیں، جن کے سر میں ایک تنقید نگار اور سینے میں ایک تخلیق کار چھپا ہوا ہے۔'[1]

اس انتساب میں انھوں نے صاف طور پر یہ بات کہہ دی ہے کہ جو تحقیق کار (ریسرچ اسکالر) آج اپنے تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں، اُنھیں صحیح معنی میں اس لیے محقق نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ ہر چند کہ وہ اپنی سندی ضروریات کے تحت کسی نہ کسی موضوع پر تحقیق کرنے میں مصروف ہیں، لیکن ان کا ذہن یا تو تنقید نگاری کی جانب مائل ہے یا وہ شاعر یا فکشن نگار بننا چاہتے ہیں۔

گیان چند جین نے تحقیق کاروں کے حوالے سے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ تحقیق کا فن تحمّل اور دل جمعی کا متقاضی ہے۔ یہ پِتّا مارنے کا کام ہے۔ اِس میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور سر کھپانا پڑتا ہے۔ اسی لیے بہت کم لوگ تحقیق کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ یہ بات اِس لیے بھی سچ ہے کہ ہمارے بیش تر اساتذۂ اُردو جو پہلے یونی ورسٹی ریسرچ اسکالر تھے، لیکن سند ملنے کے بعد اُنھوں نے شاعر، نقاد، ناول و افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ مثال کے طور پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک معین احسن جذبی نے 'حالی کا سیاسی شعور' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ.ڈی کی سند حاصل کی، لیکن بعد میں وہ معروف ترقی پسند شاعر بن گئے۔ اسی طرح قاضی عبدالستار نے 'اردو شاعری میں قنوطیت' پر تحقیقی مقالہ لکھا اور سند حاصل کی، لیکن بعد میں ممتاز ناول و افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی، لیکن اس کے بعد شاعری اور تنقید نگاری کی جانب مائل ہوگئے۔ شہریار کو بھی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالے 'انیسویں صدی میں اردو تنقید کے رجحانات' پر پی ایچ.ڈی کی سند دی، لیکن اردو تنقید پر کچھ لکھنے کی بجائے انھوں نے شاعری کو اپنا شعار بنایا اور عہدِ جدید کے ممتاز ترین شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ایک ریسرچ اسکالر (تحقیق کار) جس موضوع پر ریسرچ کرتا ہے یا اپنا تحقیقی کام انجام دیتا ہے، اس کا مقصد متعلقہ یونی ورسٹی سے محض ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنا ہوتا ہے جو کیریر سازی اور اس کے بہتر مستقبل کی ضامن ہوتی ہے۔ ان سندی تحقیق کاروں میں خال خال ہی کوئی ایسا باہمت ہوتا ہے جو تحقیق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتا ہے۔

اگر گذشتہ سو برسوں کی اردو تحقیق کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو محققین کی تعداد محض انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اوّلین اردو محققین میں سیّد شمس اللہ قادری، حافظ محمود خاں شیرانی، مولوی عبدالحق، نصیرالدین ہاشمی، محی الدین قادری زور اور مسعود حسن رضوی ادیب کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے بعد کے محققین میں امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، مسعود حسین خاں، مالک رام، رشید حسن خاں اور حنیف نقوی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

تحقیق کے کئی مراحل و مدارج ہیں۔ جب کوئی تحقیق کار کسی تحقیقی کام کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کے ذہن میں اس کام سے متعلق ایک خیال یا تصور قائم ہوتا ہے جسے 'موضوع' کہہ سکتے ہیں۔ موضوع کا تعین تحقیق کار خود بھی کرسکتا ہے یا متعلقہ یونی ورسٹی کے اپنے استاد یا نگراں (Supervisor) کے صلاح و مشورے کے بعد بھی طے کرسکتا ہے۔ اگر موضوع بہت پھیلا ہوا ہے تو اس کی حد بندی (Delimitations) کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر 'جدید حسّیت' (Modern Sensibility) ایک بہت وسیع موضوع ہے۔ معاصر افسانہ نگاروں کے یہاں اس کے نقوش پائے جاتے ہیں، چناں چہ اسے محدود (Delimit) کرکے 'سلام بن رزاق کے افسانوں میں جدید حسّیت' کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح 'اردو کا آغاز و ارتقا' بھی ایک نہایت وسیع موضوع ہے، چناں چہ اسے بھی محدود کرکے 'اردو کے آغاز و ارتقا میں کھڑی بولی کا کردار' کیا جاسکتا ہے۔

اِن دونوں موضوعات کی حیثیت محض مفروضے (Hypothesis) کی ہے۔ انھیں دلائل کے ساتھ پرکھنا ہوگا، اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا واقعتاً سلام بن رزاق کے افسانوں میں جدید حسّی عناصر کی کارفرمائی ہے۔ اسی طرح دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرنا ہوگا کہ آیا اردو کے آغاز و ارتقا میں کھڑی بولی کا کوئی کردار ہے۔ تاوقتیکہ ان موضوعات کو تحقیق (جو دلائل کی متقاضی ہے) کی روشنی میں پرکھ نہ لیا جائے، ان کی حیثیت محض مفروضے (Hypothesis) کی ہوگی یا زیادہ سے زیادہ انھیں 'پیش گوئی' (Prediction) کہا جاسکتا ہے۔ تحقیق کے عمل سے گزارنے اور دلائل و براہین کی روشنی میں پرکھنے کے بعد ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلام بن رزاق کے افسانوں میں حسّی عناصر پائے جاتے ہیں یا اردو کے آغاز و ارتقا میں کھڑی بولی کا کردار رہا ہے۔

موضوع کے تعین کے بعد تحقیق کار اپنے تحقیقی کام کا ایک خاکہ تیار کرتا ہے جس میں وہ پورے تحقیقی کام کو ابواب میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے بعد ہی اصل تحقیقی کام کا آغاز ہوتا ہے جو دو بڑے حصوں میں منقسم ہے: (1) مواد کی حصول یابی اور مطالعہ (2) مقالے کی تسوید و ترتیب۔

تحقیقی مواد کی حصولیابی کے کئی ذرائع ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ذریعہ کتب خانے ہیں جہاں کتابوں، رسالوں اور مسودات کا قیمتی ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ تحقیق کار ان میں سے اپنی ضرورت کی کتابیں اور دیگر مواد حاصل کرسکتا ہے اور اپنے موضوع سے متعلق نوٹس تیار کرسکتا ہے۔ تحقیقی مواد حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ انٹرویوز ہیں۔ تحقیق کار اپنے موضوع سے متعلق ایک سوال نامہ تیار کرکے ایسے اہلِ علم حضرات سے معلومات حاصل کرسکتا ہے جو زیرِ تحقیق موضوع پر درک رکھتے ہیں۔ اگر تحقیق کا موضوع کسی ایسے ادیب یا تخلیقی فن کار کی ادبی خدمات سے متعلق ہے جو بہ قیدِ حیات ہے تو تحقیق کار اس ادیب یا فن کار سے وقت طلب کرکے ملاقات کرسکتا ہے اور اپنے موضوع سے متعلق اس سے دوبدو گفتگو کرسکتا ہے۔ تحقیق کار انٹرویو کے دوران ٹیپ ریکارڈر کا بھی استعمال کرسکتا ہے۔ مواد کی حصول یابی کے بعد تحقیق کار کو وافر وقت مواد کے مطالعے میں صرف کرنا چاہیے۔

مواد کی حصول یابی اور مطالعے کے بعد تحقیقی مقالے کی تسوید و

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

ترتیب کا کام شروع ہوتا ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں تحقیق کار کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر اُس کے پاس اپنے نقطۂ نظر کا دفاع کرنے کے لیے دلیلیں، سندیں اور ثبوت موجود ہوں تو وہ عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ تحقیق کے اسی مرحلے میں استدلالی طریقِ کار سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر اس کی دلیلیں ٹھوس نہ ہوئیں اور بودی یا کمزور ہوئیں تو بعد کے دور کے محققین ان دلیلوں کو یکسر مسترد کر سکتے ہیں۔ دلائل ہی کی مدد سے کسی بات یا نظریے کو درست ثابت کیا جاسکتا ہے، اور دلائل ہی کی مدد سے کسی بات یا نظریے کو رد بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے تحقیق میں استدلالی طریقِ کار کی بے حد اہمیت ہے۔ اس کی لسانی تحقیق سے یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(1) محمد حسین آزاد (1830-1910) نے اپنی کتاب 'آبِ حیات' (1880) میں دیباچے کے بعد 'زبانِ اردو کی تاریخ' بیان کرتے ہوئے یہ عبارت لکھی ہے:

'اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندستانی زبان ہے۔'[2]

آزاد نے اپنے اس بیان کی تائید میں نہ تو کوئی دلیل پیش کی اور نہ وہ کوئی سند لائے اور نہ ہی اردو کا برج بھاشا سے موازنہ کیا جس سے انھیں یہ پتا چلتا کہ اردو اور برج بھاشا لسانیاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، لہٰذا اردو کا برج بھاشا سے نکلنے کا کوئی جواز نہیں۔ بعد کے محققین اور ماہرینِ لسانیات نے آزاد کے اس قول کو مسترد کر دیا کہ 'اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔' ماہرینِ لسانیات کی دلیل یہ رہی ہے کہ اردو کا لسانی ڈھانچا (Linguistic structure) برج بھاشا سے مختلف ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اردو کے جو اسما، ضمائر، صفات اور افعال 'الف' [ا] پر ختم ہوتے ہیں وہ برج بھاشا میں 'واؤ' [و] میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی دور میں 'واؤ' پر ختم ہونے والی شکلیں (O ending forms) اختیار نہیں کیں۔ دکنی اردو میں بھی اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔ اردو اور برج بھاشا کے لسانی افتراق کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

اردو	برج بھاشا
بیٹا	بیٹو (اسم)
میرا	میرو (ضمیر)
بڑا	بڑو (صفت)
آیا، گیا، کھایا	آیو، گیو، کھایو (فعل)
ساون آیا	ساون آیو
میرا بڑا بیٹا دہلی گیا	میرو بڑو بیٹو دلّی گیو
میری ماں! میں نے مکھن نہیں کھایا	'میّا موری میں نہیں ماکھن کھایو' (سورداس)

نوٹ: سورداس برج بھاشا کے عظیم شاعر ہیں۔

اردو کے برج بھاشا سے 'نکلنے' کے بیان کو کچھ اہلِ علم (لاعلمی کی بنا پر) محمد حسین آزاد کے نظریۂ آغازِ زبانِ اردو سے تعبیر کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ ہے ہی نہیں، یہ محض قیاس آرائی ہے۔ نظریے کے دلائل کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ استدلالی طریقِ کار سے ہی بات کو صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے، اور سچائی تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اگر دلائل نہ پیش کیے جائیں اور سند نہ لائی جائے تو بات میں کوئی سچائی یا اصلیت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ محض فرض کی ہوئی چیز بن کر رہ جاتی ہے جسے 'مفروضہ' (Hypothesis) کہہ سکتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کا یہ کہنا کہ 'اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے' محض ایک مفروضہ ہے جس کی لسانیاتی ادب میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

(2) اِس نوع کی ایک اور مثال اردو کے سندھ میں پیدا ہونے کی ہے۔ یہ بھی اردو کی پیدائش کا کوئی نظریہ نہیں، بلکہ محض قیاس آرائی ہے جو معروف عالم اور مفکرِ دین سیّد سلیمان ندوی (1884-1953) کے ذہن کا اختراع ہے۔ وہ اردو کی پیدائش کو مسلمانوں کی سندھ میں آمد سے منسوب کرتے ہیں اور قیاس کی بنا پر (تحقیق کی بنیاد پر نہیں) سندھ کو اردو کی جاے پیدائش قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب 'نقوشِ سلیمانی' (1939) میں لکھتے ہیں:

'مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'[3]

سیّد سلیمان ندوی کا مسلمانوں کی سندھ میں آمد کو اردو کی پیدائش کا سبب بتانا اور وادیِ سندھ کو اردو کی جاے پیدائش قرار دینا یہ دونوں ہی باتیں غلط، بے بنیاد اور غیر منطقی ہیں، نیز ہند آریائی خاندانِ السنہ کے ارتقا سے عدمِ واقفیت کا نتیجہ ہیں، کیوں کہ جو مسلمان 711 میں فاتح کی حیثیت سے سندھ میں داخل ہوئے وہ عربی گو تھے۔ ان کا اردو سے کوئی لینا دینا نہیں تھا اور نہ وہ اردو کی پیدائش کا سبب بنے، کیوں کہ عربی ایک سامی زبان (Semitic Language) ہے اور اردو کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے۔ ان دونوں زبانوں کے لسانی ڈھانچوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، لہٰذا عربی سے اردو بھلا کیسے پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ دلیل صرف ان لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے جو عربی اور اردو کے درمیان پائے جانے والے لسانی اختلاف و افتراق سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اردو کا ہیولیٰ وادیِ سندھ میں تیار ہونے کی بات بھی حقائق سے کوسوں دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے داخلۂ سندھ کے وقت وہاں کی زبان براچڑ (یا براچڈ) اپ بھرنش تھی۔ اسی سے 1000 عیسوی کے آس پاس علاقۂ سندھ میں موجود سندھی زبان کی قدیم شکل کا ارتقا ہوا۔ دوسری جانب 1000 عیسوی ہی کے لگ بھگ دہلی و نواحِ دہلی میں شورسینی اپ بھرنش کے کھڑی بولی کی ابتدائی شکل معرضِ وجود میں آئی جس سے اردو کے بیج پھوٹنا شروع ہوئے۔ اردو کے ارتقا میں نواحِ دہلی کی دوسری بولیوں نے بھی مدد پہنچائی۔ اس طرح اردو اور سندھی نے مختلف مآخذ (Sources) سے الگ الگ علاقوں میں ارتقا پایا۔ دونوں زبانیں تاریخی اور لسانی اعتبار سے علاحدہ زبانیں ہیں۔ مسلمانوں کا نہ سندھی کی پیدائش سے کوئی تعلق ہے اور نہ اردو کے معرضِ وجود میں آنے سے۔ اردو کی پیدائش کے سلسلے میں سیّد سلیمان ندوی کی قیاس آرائیوں کو مسترد کرنے کے لیے یہ دلائل کافی ہیں۔

(3) اس سلسلے کی ایک تیسری مثال مستند دلائل کی بنیاد پر حافظ محمود خاں شیرانی (1880-1946) کے پنجاب میں اردو کے پیدا ہونے کے نظریے کو مسترد کرنے کی ہے۔ شیرانی نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' (1928) میں یہ ثابت کرنے کے لیے اپنا سارا زور صرف کر دیا ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

'اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے، اور جب سیانی ہوگئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی۔'[4]

شیرانی کے اس نظریے کی رو سے اردو، پنجاب میں پیدا ہونے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے دہلی چلی جاتی ہے، چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

'اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے، اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔'[5]

شیرانی کے ان نظریات کو معروف ماہرِ لسانیات مسعود حسین خاں (1919-2010) نے ٹھوس اور مستند دلائل سے رد کر دیا ہے۔ ان کا طرزِ استدلال لسانی اور تاریخی دونوں ہے۔ ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اردو پنجاب میں نہیں بلکہ دہلی و نواحِ دہلی میں پیدا ہوئی ہے۔ اس کی تشکیل میں نواحِ دہلی کی بولیوں بالخصوص کھڑی بولی اور ہریانوی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہ اپنی تحقیقی تصنیف 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' (ساتواں اڈیشن، 1987) میں لکھتے ہیں:

'دہلی اردو کا حقیقی مولد و منشا ہے۔'

اسی تصنیف میں وہ نواحِ دہلی کی بولیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

'قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی [بولی] اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔'[7]

مسعود حسین خاں کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قدیم اردو (بہ شمولِ دکنی اردو) پر شیرانی نے پنجاب کے جو اثرات بتائے ہیں وہ درحقیقت ہریانوی کے اثرات ہیں، کیوں کہ ہریانہ دہلی سے متصل ہے اور دہلی کے شمال مغرب میں آج بھی ہریانوی بولی کا چلن ہے۔ مسعود حسین خاں نے اپنی متذکرہ تصنیف میں قدیم اردو (دکنی اردو) پر ہریانوی کے بے شمار لسانی اثرات کا ذکر کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قدیم اردو اور دکنی کا 'پنجابی پن' اس کا 'ہریانوی پن' بھی ہے۔ آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ 'شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلے میں ہریانی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔'

پنجاب میں اردو کے پیدا ہونے کے بعد، نقلِ مکانی کے شیرانی کے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے مسعود حسین خاں تیسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ 'اتنے بڑے پیمانے پر، کہ نواحِ دہلی کی زبان کو بدل دیا ہو، تاریخ سے اس قسم کے کسی نقلِ مکانی کی شہادت نہیں ملتی۔'[8]

مسعود حسین خاں کی متذکرہ تینوں دلیلیں تاحال ناصواب نہیں ثابت کی جاسکتی ہیں۔

تحقیق ایک مشکل فن ہے۔ اس کا بنیادی مقصد سچائی تک پہنچنا اور حقائق کا پتا لگانا ہے۔ ایک محقق اسی وقت اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے جب وہ استدلالی طریقِ کار اختیار کرتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کو دلائل و براہین سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، ورنہ اس کا نقطۂ نظر محض 'قیاس آرائی' یا 'مفروضہ' بن کر رہ جاتا ہے۔

حواشی:

1- گیان چند جین، 'تحقیق کا فن' (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، 2008، 'انتساب'۔

2- محمد حسین آزاد، 'آبِ حیات' (کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، 1967 ایڈیشن)، ص13۔

3- سیّد سلیمان ندوی، 'نقوشِ سلیمانی' (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، 1939)، ص31۔

4- حافظ محمود شیرانی، 'پنجاب' میں اردو' (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1970 ایڈیشن)، ص99۔

5- ایضاً، ص19۔

6- مسعود حسین خاں، 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اُردو' (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1987 ایڈیشن)، ص262۔

7- ایضاً، ص236۔

8- مسعود حسین خاں، 'اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'، مشمولہ 'اردو زبان کی تاریخ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1995)، ص86۔

مرزا خلیل احمد بیگ
اُجالا میڈیکل سنٹر، B-2247، اندرا نگر، لکھنؤ-226016
E-mail: mirzakhalil2012@gmail.com

☆☆☆

فیضؔ کی متاعِ لوح و قلم

عارف عزیز

اپنے فکری اور شعری ارتقا کے لحاظ سے فیض احمد فیضؔ نے اردو شعروادب کو ایک رُتبہ و مقام دیا اور اُس کے وقار کو آفاقی بنا دیا۔ فیضؔ اردو کے وہ مُنفرد شاعر ہیں جنھوں نے ملک اور بیرونِ ملک کی مختلف زبانوں کے شاعروں، ادیبوں اور عام انسانوں کو متاثر کیا۔ فیضؔ کی شاعری میں عوام کی جدوجہد کا عکس نظر آتا ہے جو دنیا کے مختلف ممالک میں عوام اور جمہوری ترقی کے لیے جاری ہے۔ خاص طور پر ہندستان اور پاکستان کے لیے فیض کی شاعری عصرِ حاضر کی روح کا درجہ رکھتی ہے۔ ایشیائی ادیبوں نے جمہوریت کے لیے اور سامراج و آمریت کے خلاف جو جدو جہد کی، فیضؔ اُس قافلے کے سالار رہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فیضؔ اُن بڑے شعرا میں سے ایک ہیں جنھیں برِّصغیر کی کسی زبان نے بیسویں صدی میں پیدا کیا۔ اپنی اِس بڑائی کی وجہ سے فیضؔ ادیبوں اور شاعروں کی عالمی کانفرنسوں میں اہم رکن کی حیثیت سے اُردو کی نمائندگی کرتے رہے اور اُن کے بعد ایسی کانفرنسوں میں اردو کی جگہ خالی رہی ہے۔

اِس سے پہلے یہ مرتبہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کو ملا کہ ان کے بارے میں اہلِ نقد و نظر متفق تھے کہ اردو کی محفل میں ایسا چراغ پھر روشن نہ ہوگا لیکن اقبالؔ کے بعد فیض نمودار ہوئے جو مقامِ اقبالؔ تک پہنچ سکے اور اقبالؔ کی طرح فیض کے ذریعے بھی وہ انقلاب آیا جس نے ہم عصر شعرا کو جھنجھوڑنے کے ساتھ شعوری یا لاشعوری طور پر آنے والی نئی نسلوں کو بھی متاثر کیا۔ اِس طرح بیسویں صدی میں اردو شاعری کو ایک آفاقی پیغام سے متاثر کرنے کا سہرا اقبال کے سر ہے لیکن اقبال کا انداز پیغمبرانہ ہے وہ کافی بلندی سے حیات و کائنات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اُن کی فکر و عمل کے لیے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، اقبال کی نظر انسان کی بیچارگی و غلامی پر مرکوز رہی۔ جاگیردارانہ تہذیب اور سرمایہ دارانہ استحصال کے وہ ناقد ہیں اور اُن تمام برائیوں کو انھوں نے ہوسِ اقتدار اور دولت کی محبت کا نتیجہ قرار دے کر جدو جہد اور حق کے لیے جان تک لڑا دینے کا درس دیا۔

لیکن فیضؔ عام انسانوں کی سطح پر سوچتے ہیں، اُن کے یہاں اقبالؔ جیسا بلند آہنگ نہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ دُور سے کسی پُکارنے والے کی مدھم آواز آرہی ہے۔ فیضؔ دماغوں پر ہتھوڑا نہیں چلاتے وہ دردمند دلوں پر ہلکے ہلکے دستک دیتے ہیں۔ فیضؔ نے مظلوموں کے حقوق کی جدوجہد کو اپنے شعر کا موضوع بنایا مگر اِس فنکاری سے کہ سننے والے نے اپنے دل کے پٹ کھول دیے۔

فیضؔ کے فکر و فن کی جِلا میں کئی عوامل کا دخل رہا جن میں بیسویں صدی کے نصف آخر کے سیاسی محرکات، پھانسی کے سایے میں قید و بند کی طویل مشقت اور اپنے اردگرد کے انسانوں کا قریبی مطالعہ شامل ہے۔ فیضؔ کی شہرت اُن کے پہلے مجموعۂ کلام 'نقشِ فریادی' کے ساتھ پھیلی جس میں اُن کی نظمیں 'آخری خط'، 'سرودِ شبانہ'، 'تہہ نجوم'، 'میرے ندیم' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نظمیں جو بہت سادہ اور معمولی ہیں لیکن ان میں نوجوان کے معصوم جذبوں کی دھیمی دھیمی آنچ موجود ہے۔ بعد میں 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' میں فیضؔ روایتی عشق سے بڑھ کر غمِ دنیا اور غمِ انسانیت کے گرد دائرہ کھینچنے اور انسانی زندگی کے کئی موضوعات کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ بعد میں رومان فیضؔ کا لہجہ ضرور بنا مگر جذبہ، اُن کی زبان اور عصری شعور اُن کا رہنما ہوگیا، یہی فیضؔ کی شاعری کے وہ ترکیبی عناصر ہیں جو اُن کو آفاقیت اور غنائیت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

فیضؔ کے شعری نصب العین کا اندازہ اُن کی نظم ''سرِ وادیِ سینا' کے اُس انتساب سے ہوتا ہے جس میں فیضؔ نے دبے کچلے طبقات اور انسانوں کی امنگوں کو زبان دی ہے۔ فیضؔ سے پیش تر اِن طبقات کا تذکرہ جس نے بھی کیا اُس پر فنی تخلیق سے زیادہ پروپگنڈہ کا گمان ہوا لیکن فیضؔ نے پہلی بار احساس دلایا کہ یہ طبقات صرف معاشی یونٹ نہیں، گوشت و پوست کے انسان ہیں۔ فیضؔ کا تخیل اور تخلیق کسی ایک طبقے تک محدود نہیں، وہ بنی نوعِ انسان کے شاعر ہیں۔ دنیا بھر کے مظلوموں اور بے کس و لاچار انسانوں کے لیے امید کا پیغام لاتے ہیں اور انسانیت کُش طاقتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کی پکار لگاتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ فیضؔ نے اپنے اشعار میں نئے الفاظ استعمال نہیں کیے، پُرانے بت نہیں توڑے، علامتوں میں روایتوں سے انحراف نہیں کیا۔ نہ اصول و عروض سے سرکشی کی اِس کے باوجود اقبالؔ کی طرح جو بھی کہا وہ نیا تھا۔ تیشہ و فرہاد، سنگ و خشت، تیر و تفنگ، قتل و قاتل، سیر و زنجیر، تشہیر و تحریر، ساقی و شراب، دشت و چمن، سلام و پیام، چوڑیوں کی کھنک، پھولوں کی مہک، کاجل کی لکیر اور ایسے سیکڑوں الفاظ و ترکیبیں جن سے فیضؔ نے کام لیا۔ یہ تراکیب پُرانی اور مانوس ہونے کے باوجود نئی اور منفرد نظر آنے لگیں۔ جب یہ مانوس جذبے فیضؔ کے کسی شعر کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں تو اُن کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ انگلیاں خونِ دل میں ڈوب جاتی ہیں، کوے جاناں کی نامہرباں خاک پر لہو روشن ہوجاتا ہے، ہر حلقۂ زنجیر میں زباں پیدا ہوجاتی ہے، خطا و جرم سے پہلے ہی سزا و عتاب سے سابقہ پڑتا ہے۔ سُرخیِ مے سے تزئینِ در و بامِ حرم کی جاتی ہے، راہِ وفا بہت مختصر ہوجاتی ہے۔

فیضؔ نے ہندستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ تعلقات کو پروان چڑھانے کے لیے بھی نمایاں کام کیے۔ فیض کے خیال میں اِس برِّصغیر ہند و پاک کی ثقافت میں ایک وحدت ہے جس کی قدر اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

فیضؔ اپنے اِن خیالات کے باعث ہی ہندستان اور پاکستان میں دوستی کی علامت بن گئے تھے۔ دونوں ملکوں کے درمیان ایک کڑی، کئی زبانوں کے بیچ ایک پُل اور متعدد تہذیبوں کے لیے قطب نُما سمجھے جانے لگے تھے۔ یوں فیضؔ کے اشعار کا رشتہ پوری دنیا کے دکھیاروں سے جڑ گیا اور اُن کی شاعری میں عوام دوستی، آفاقیت و عظمت کے وہ عناصر جمع ہوگئے جو ہر بڑے شاعر کے کلام کی خصوصیت ہوا کرتے ہیں۔

20-گھاٹی بھڑبھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

اپنے فکری اور شعری ارتقا کے لحاظ سے فیض احمد فیضؔ نے اردو شعر و ادب کو ایک رُتبہ و مقام دیا اور اُس کے وقار کو آفاقی بنا دیا۔ فیضؔ اردو کے وہ مُنفرد شاعر ہیں جنھوں نے ملک اور بیرونِ ملک کی مختلف زبانوں کے شاعروں، ادیبوں اور عام انسانوں کو متاثر کیا۔ فیضؔ کی شاعری میں عوام کی جدو جہد کا عکس نظر آتا ہے جو دنیا کے مختلف ممالک میں عوام اور جمہوری ترقی کے لیے جاری ہے۔ خاص طور پر ہندستان اور پاکستان کے لیے فیض کی شاعری عصرِ حاضر کی روح کا درجہ رکھتی ہے۔ ایشیائی ادیبوں نے جمہوریت کے لیے اور سامراج و آمریت کے خلاف جو جدو جہد کی، فیضؔ اُس قافلے کے سالار رہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فیضؔ اُن بڑے شعرا میں سے ایک ہیں جنھیں برِّصغیر کی کسی زبان نے بیسویں صدی میں پیدا کیا۔ اپنی اِس بڑائی کی وجہ سے فیضؔ ادیبوں اور شاعروں کی عالمی کانفرنسوں میں اہم رکن کی حیثیت سے اُردو کی نمائندگی کرتے رہے

اردو دُنیا

اسکولوں میں اچھی تعداد میں اردو اساتذہ کی تقرری خوش آئند

پٹنہ (28دسمبر)۔ بہار پبلک سروس کمیشن (بی پی ایس سی) کی جانب سے محکمۂ تعلیم حکومتِ بہار کے تحت ہائر سکنڈری اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری کے لیے رزلٹ جاری ہوگیا ہے۔ اچھی خاصی تعداد میں اردو اساتذہ کی بحالی بھی عمل میں آئی ہے۔ بی پی ایس سی کی جانب سے حالیہ برسوں میں اساتذہ کی تقرری کی گئی ہے جس میں دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ اردو کے اساتذہ کی بھی تقرری کی گئی ہے۔ اچھی خاصی تعداد میں اردو اساتذہ کی تقرری خوش آئند ہے۔ اردو آبادی کی جانب سے اردو اساتذہ کی تقرری کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

کشن گنج کے سی بی ایس ای اسکولوں میں اردو پڑھانے کے حکم پر بی جے پی کو اعتراض

پٹنہ (یکم جنوری)۔ بی جے پی کی مسلمانوں سے نفرت کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے، لیکن اب بی جے پی والے اردو زبان کے خلاف بھی کھل کر بولتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ بہار کے کشن گنج ضلع میں ضلع ایجوکیشن افسر (ڈی ای او) کے ذریعے اردو تعلیم لازمی بنانے سے متعلق ایک حکم پر کچھ بی جے پی لیڈران نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر اسکولوں میں جبراً اردو پڑھائی تو پھر وہ دعائیہ اجلاس میں 'گایتری منتر' پڑھانے کا مطالبہ کریں گے۔ دراصل ڈی ای او ناصر حسین نے ضلع کے سبھی سی بی ایس ای اسکولوں میں طلبہ وطالبات کو اردو زبان پڑھانے کے لیے حکم جاری کیا ہے۔ انھوں نے یہ حکم سی بی ایس ای سے منظور شدہ سبھی پرائیویٹ اسکولوں کو خط لکھ کر جاری کیا ہے۔ خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ ضلع ڈیولپمنٹ کو آرڈی نیشن ونگرانی کمیٹی کی میٹنگ میں کانگریس رکنِ اسمبلی اظہارالحسین اور رکنِ پارلیمنٹ ڈاکٹر جاوید آزاد کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ ضلع میں چل رہے پرائیویٹ اسکولوں میں اردو کی پڑھائی نہیں ہورہی، جب کہ اس ضلع میں اقلیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خط میں سبھی سی بی ایس ای اسکولوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ طلبہ وطالبات کو اردو زبان پڑھائیں۔ اس خط میں ڈی ای او ناصر حسین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سی بی ایس ای بورڈ سے منظور شدہ اس ضلع میں چلنے والے سبھی پرائیویٹ اسکول طلبہ وطالبات کو اردو کی پڑھائی کے لیے ضروری انتظام یقینی کرتے ہوئے تعمیلی رپورٹ بہار ایجوکیشن پروجیکٹ آفس کو دستیاب کروائیں۔ اس خط سے کئی پرائیویٹ اسکولوں کے مالکان ناراض دکھائی دے رہے ہیں۔ جب یہ خبر بی جے پی لیڈران کو ملی تو انھوں نے ہنگامہ شروع کر دیا، حالاں کہ ضلع ایجوکیشن افسر کا کہنا ہے کہ یہ حکم خاص طور پر ان طلبہ کے لیے جاری کیا گیا ہے جو اردو پڑھنے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ بی جے پی ضلع صدر سشانت گوپ نے اس معاملے میں اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی دباو میں اسکولوں میں اردو کی پڑھائی قابلِ قبول نہیں ہے۔

(اردو ٹائمز۔ ممبئی)

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے منہ پر اُردو اکادمی دلی کا طمانچہ

خالی اسامیوں کے لیے بھرتی اشتہار میں لکھا 'تقرر کسی بھی وقت بغیر کوئی وجہ بتائے ختم کیا جاسکتا ہے'

نئی دہلی (4جنوری)۔ دہلی اردو اکادمی میں کافی وقت سے بیش تر اسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں۔ اردو والوں کے شدید مطالبے کے بعد اکادمی نے اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے اشتہار نکالا ہے۔ اشتہار میں مختلف اسامیوں کے لیے معاہدے پر درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ اشتہار میں لکھا ہے کہ 'یہ تقرر کسی بھی وقت بغیر کوئی وجہ بتائے ختم کیا جاسکتا ہے۔' اس کی زبان کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے دہلی اردو اکادمی نے بے روزگار نوجوانوں کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ اکادمی کے اس طرزِ عمل سے اردو والوں میں بے چینی پائی جاتی ہے کیوں کہ عرصۂ دراز کے بعد خالی اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے اشتہار جاری کیا گیا ہے۔ اشتہار جاری ہونے کے بعد لوگ اپنا ردِّعمل دے رہے ہیں اور اس کو بے روزگاروں کے ساتھ مذاق قرار دے رہے ہیں۔ بتا دیں کہ دہلی میں اردو کے اعلا تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کی تعداد کافی زیادہ ہے لیکن جس طرح کا اشتہار اردو اکادمی نے جاری کیا ہے اس سے اردو والے کافی مایوس ہیں کیوں کہ اس معاہدے کی کوئی مدت نہیں بتائی ہے بلکہ لکھا گیا ہے کہ تقرر کسی بھی وقت بغیر کوئی وجہ بتائے ختم کیا جاسکتا ہے۔ اکادمی کے اس اشتہار سے امیدوار نوکری کو غیر محفوظ محسوس کررہے ہیں کیوں کہ پہلی بار ایسا دیکھنے کو ملا ہے کہ کسی بھی وقت بغیر کوئی وجہ بتائے نوکری ختم کرنے کی بات لکھی گئی ہے حالاں کہ دہلی اردو اکادمی میں جتنی اسامیاں خالی ہیں وہ تمام سرکار کی طرف سے مستقل اور منظور شدہ ہیں لیکن پھر بھی اکادمی نے ان کو بھرنے کے لیے جس طرح کا اشتہار نکالا ہے اس نے اردو والوں میں تشویش کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ دہلی اردو اکادمی نے چیف اکاؤنٹنٹ، اسسٹنٹ ایڈیٹر، سب ایڈیٹر، ہیڈ لائبریرین، کاتب، جونیر کمپیوٹر آپریٹر، اسٹینو گرافر اور اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدوں پر بھرتی کے لیے اشتہار جاری کیا ہے جس کی مزید تفصیلات کے لیے اکادمی کی ویب سائٹ پر جانے اور آن لائن درخواست جمع کرنے کو کہا گیا ہے۔ خبر لکھے جانے تک اکادمی کی ویب سائٹ پر مذکورہ اشتہار کے لیے کوئی لنک ڈالا نہیں گیا ہے۔ یعنی جب لنک ڈالا ہی نہیں گیا تو کوئی تفصیلات کیسے پڑھے گا اور کیسے آن لائن فارم درخواست دے گا۔

عبدالراشد نے بتایا کہ مستقل نوکری نکالنے کی بجائے اردو اکادمی نے معاہدے پر بھرتی کے لیے اشتہار نکالا ہے جس کو پڑھ کر مایوس ہوں۔ ایم اے، ایم فل کرنے کے بعد اگر کوئی نوجوان نوکری کے لیے درخواست دے اور وہاں یہ شرط رکھ دی جائے گی کہ کسی بھی وقت بغیر کوئی وجہ بتائے تقرر ختم کیا جاسکتا ہے تو یہ نہایت شرمناک بات ہے۔ اگر کسی کو معاہدے پر رکھنا ہے تو معاہدہ تو گیارہ مہینے کا ہونا چاہیے اور اگر کسی کا کام اچھا ہے تو اس کے معاہدے میں توسیع کر دینی چاہیے۔ یہی روایت رہی ہے۔ طالبِ علم محمد منیر نے بتایا کہ اکادمی میں نوکری کے لیے کوئی جھلی والا یا ٹھیلہ لگانے والا درخواست نہیں دے گا، جن کو آپ جب چاہے رکھ لو، جب چاہے ہٹا دو، بلکہ تعلیم یافتہ نوجوان ہی درخواست دیں گے۔ اس طرح کی بات لکھ کر پڑھے لکھے نوجوانوں کا مذاق اُڑایا گیا ہے، بھلے ہی نوجوان بے روزگار ہیں لیکن اعلا تعلیم یافتہ تو ہیں اور اتنے تعلیم یافتہ نوجوان دہلی میں موجود ہیں کہ اگر ان کا صحیح اور پوری طرح تقرر ہوجائے تو وہ اکادمی کے قیام کے اغراض ومقاصد کو واقعی میں پورا کر کے دکھا سکتے ہیں۔

دہلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے ممبر شیخ علیم الدین اسعدی نے کہا کہ اردو والوں کے مطالبے پر ہی ہم نے کوشش کر کے خالی اسامیوں کو بھرنے کے لیے اشتہار جاری کروایا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ترجمے کی غلطی کی وجہ سے اس طرح کی بات چھپ گئی ہے، ہفتے اور اتوار کو تعطیلات کی وجہ سے اکادمی بند رہتی ہے، ہم اس پر بات کریں گے اور اس کو درست کرائیں گے۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر شہپر رسول کو فون کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی کہیں آیا ہوں، ابھی بات نہیں کرسکتا۔ اس بارے میں بات کرنے کے لیے دہلی اردو اکادمی کی سینئر اسٹاف ممبر پونم کو بھی فون کیا گیا لیکن انھوں نے فون ریسیو نہیں کیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

اُردو میں زمانے کی ضرورت سے ہم آہنگ ہونے کی پوری صلاحیت ہے

پورنیہ کالج میں 'اردو ادب اور مستقبل' کے موضوع پر پروگرام کا انعقاد

پورنیہ (24دسمبر)۔ اردو زبان میں عصری ضرورتوں سے ہم آہنگ ہونے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ جس زبان میں عام شخص کو اپنی طرف کھینچنے کی طاقت اور کشش ہو، وہ کبھی نہیں مرسکتی۔ اردو زبان و ادب میں یہ چیز بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ باتیں پورنیہ کالج میں 'تعارفی تقریب اور توسیعی خطبہ' میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی نئی دہلی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر احمد علی جوہر نے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اردو زبان وادب کو درپیش مسائل وچیلنجز کی طرف بھی اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ سرکاری وغیر سرکاری دونوں شعبوں میں اردو زبان وادب کے لیے بہتر امکانات پیدا ہورہے ہیں لیکن ان امکانات تک پہنچنے کے لیے بھرپور محنت کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر احمد علی جوہر نے کہا کہ اردو زبان وادب کا ذخیرہ کافی وسیع اور ثروت مند ہے۔ اردو درباروں اور محلوں سے لے کر فقیروں، بوریہ نشینوں اور عوام الناس کی زبان ہے۔ اردو میں ہر طرح کے انسانی جذبے کے اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو سب کو اپناتی ہے۔ ہندستان سے لے کر خلیجی ممالک سمیت امریکہ، یورپین وافریقی ممالک تک اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے اور نجی سیکٹر میں اردو داں کے لیے ملازمت کی راہیں بھی ہموار ہورہی ہیں۔ ڈاکٹر احمد علی جوہر نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی اور پورنیہ کالج کے شعبۂ اردو کی خدمات کو سراہا اور صدرِ شعبہ ڈاکٹر مجاہد حسین کو مبارک باد پیش کی۔

پورنیہ کالج پورنیہ کے پرنسپل پروفیسر اشتیاق نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے اور حکومت بھی اس کے فروغ کے لیے سرگرم ہے لیکن اہلِ اردو میں خاطر خواہ بیداری نہیں پائی جاتی ہے، اس لیے اہلِ اردو کو اس جانب توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اردو زبان وادب کی صورتِ حال پر بھی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر تبریز حسن نے اردو زبان وادب کے مستقبل پر روشنی ڈالی اور طلبہ وطالبات کو اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لاکر اردو زبان وادب میں بہتر مستقبل بنانے کا مشورہ دیا۔ دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر غلام سرور نے بیرونی ممالک میں اردو زبان وادب کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اے. وشوکرما نے اپنے تجربات کی روشنی میں اردو زبان وادب کے چیلنجز کی جانب اشارہ کیا اور اس کے بہتر امکانات پر بھی گفتگو کی کہ حکومتِ بہار اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔ یہ تہذیب وثقافت اور بھارت کی نمائندہ اور عوام کے رابطے کی زبان ہے۔ آخر میں صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر مجاہد حسین نے مہمانوں کا استقبال کیا اور پروگرام کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ (انقلاب۔ دہلی)

انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ کا جلسہ

رانچی (پریس ریلیز)۔ 29 دسمبر 2024 کو شام ساڑھے پانچ بجے انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ کی توسیعی میٹنگ گوگل میٹ پر زیر صدارت ڈاکٹر یاسین انصاری منعقد کی گئی۔ آن لائن میٹنگ میں رانچی سمیت دھنباد، ڈالٹن گنج، بوکارو، ہزاری باغ، گریڈیہ، دیوگھر، جام تاڑا، گڈا، دمکا، جمشید پور، رام گڑھ، کوڈرما، گڑھوا اور مانجھی کے نمائندے شامل ہوئے، جس میں اتفاقِ رائے سے 16 فروری کو رانچی میں پہلی ریاستی کانفرنس کرانے کا فیصلہ لیا گیا۔ اس کانفرنس میں وزیرِ اعلا سمیت اور دوسرے وزرا کو مدعو کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کرنے کی منظوری دے دی ہے۔

ریاستی کانفرنس میں اردو کے مسائل زیر بحث آئیں گے اور اردو کے تعلق سے قراردادیں بھی پیش کی جائیں گی جنھیں جھارکھنڈ سرکار کے گوش گزار کیا جائے گا۔

کانفرنس کے لیے ایک بڑی استقبالیہ کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس میں انجمن کے ضلعی نمائندوں کے علاوہ ہندی اردو کی نامور شخصیات کو شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر فیروز احمد استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین بنائے گئے ہیں اور ایم زیڈ خان اس کے کنوینر۔

شاہنواز خان کی سربراہی میں ریزولوشن کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس میں ڈاکٹر خالد سجاد، سید اقبال احمد، ڈاکٹر جمشید قمر اور جمیل اصغر کو شامل کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کئی ذیلی کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئی ہیں۔

میٹنگ میں اتفاقِ رائے سے فیصلہ لیا گیا کہ ہر ضلع کے منتخب ڈیلیگیٹس (مندوبین) ہی ریاستی کمیٹی کے 30 عہدیداران کا انتخاب کریں گے۔ اگلی میٹنگ 26 جنوری کو رکھی گئی ہے۔

آج کی میٹنگ کو گڑھوا سے خدا بخش انصاری، ڈاکٹر ایم این صدیقی، دھنباد سے انجینئر ایس ایم اے رضوی، گڈا سے سلیمان جہانگیر، جام تاڑا سے عبدالرقیب رحمانی، کوڈرما سے سجاد حسین، ڈالٹن گنج سے مصطفیٰ بلخی، انتخاب عالم، گریڈیہ سے ڈاکٹر انظر حسین، شازیہ تبسم، لوہردگا سے پروفیسر عبدالقدوس، بوکارو سے افضل انیس، مدھوپور سے رضا مدھوپوری، دمکا سے محمد افضل اور مانجھی سے امام الحق اور رانچی سے ڈاکٹر ریحانہ محمد علی نے خطاب کیا۔

مرکزی نمائندہ ایم زیڈ خان نے میٹنگ کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انجمن ترقی اردو کی جھارکھنڈ میں ریاستی اردو کانفرنس منعقد ہونے جارہی ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی اور تاریخی کانفرنس ہوگی جس کے دور رس اثرات مرتّب ہوں گے۔ یہ اردو آبادی کی نمائندہ لسانی تنظیم ہوگی۔ ہم اس کے توسط سے اردو آبادی کو متحرک کریں گے اور سرکار پر دباو بنائیں گے۔

آج کی میٹنگ میں رام گڑھ سے واجد علی قادری، غلام جیلانی، مدھوپور سے مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر اجمل تیمی، محمد اجمل، انور شمعون، جمشید پور سے ضیاء المبین انصاری، سمیع احمد خان، گڈا سے شمس پروانہ، ایاز احمد، گڑھوا سے صدرالدین خان، جام تاڑا سے عبدالرزاق، ہزاری باغ سے ڈاکٹر ہمایوں اشرف، رانچی سے سمیع اللہ خان اصدقی اور نجمہ ناہید انصاری شامل ہوئے۔

ڈاکٹر یاسین انصاری نے اپنے صدارتی خطاب میں اس کانفرنس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں منظّم ہوکر کانفرنس کو تاریخی حیثیت دینی ہے تبھی اردو کے مسائل پر مثبت پہل کی امید کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر فرحت جہاں نے اظہارِ تشکر پیش کیا۔ نظامت کے فرائض ایم زیڈ خان نے ادا کیے۔

گورنمنٹ جونیر کالجوں میں 1239 لکچررس کی تقرری

حیدرآباد (4 جنوری)۔ ریاست کے سرکاری جونیر کالجوں میں 1239 مستقل لکچررس کی تقرری ہوگی۔ اس سلسلے میں منتخب جونیر لکچررس کی فہرست تلنگانہ پبلک سروس کمیشن نے انٹر محکمۂ تعلیم کو سونپ دی ہے۔ دراصل 1392 لکچررس کے تقرر کے لیے ٹی جی پی ایس سی نے دسمبر 2022 میں نوٹیفکیشن جاری کیا تھا۔ مختلف وجوہ کے باعث تقرری کے عمل میں تاخیر ہوئی ہے۔ انٹر ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ذرائع نے واضح کیا ہے کہ انگریزی مضمون کے خلاف دائر کردہ مقدمے کے پس منظر میں 143 اسامیاں زیرِ التوا ہیں۔ باقی اسامیوں کے لیے منتخب ہونے والے امیدواروں کے اسناد کی آئندہ دس سے پندرہ دن میں جانچ ہونے کے قوی امکانات پائے جاتے ہیں۔ تقرری نامے وزیرِ اعلا ریونت ریڈی کی جانب سے منتخب امیدواروں کو دیے جانے کے بعد انھیں فوری پوسٹنگ دی جائے گی۔ ممکن ہے نئے لکچررس فروری سے قبل ڈیوٹی سے منسلک ہوجائیں۔ ریاست میں 424 سرکاری جونیر کالج ہیں جن میں منظور شدہ اساتذہ کی اسامیاں 6008 ہیں۔ فی الحال 900 ریگولر لکچررس اور پرنسپلس ہیں۔ مزید 3500 کنٹریکٹ لکچررس کی خدمات کو باقاعدہ بنایا گیا ہے۔ اس طرح ریاست کے سرکاری جونیر کالجوں میں 4400 لکچررس خدمات انجام دے رہے ہیں، اگر 1239 نئے لکچررس کی خدمات دستیاب ہوتی ہے تو ان کی تعداد بڑھ کر 5639 تک پہنچ جائے گی۔ صرف 369 اسامیاں خالی رہیں گی۔ زیرِ التوا انگریزی اسامیوں (153) پر بھی تقرری ہوتی ہے تو خالی اسامیوں کی مزید تعداد گھٹ کر 216 تک پہنچ جائے گی۔ تقریباً 94 فیصد خالی اسامیوں پر تقرری سے غریب طلبہ کو سرکاری جونیر کالجوں میں معیاری تعلیم حاصل ہوگی۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم اسکول کی حالتِ زار
82 طلبہ کے لیے صرف ایک مدرس

مٹ پلی (28 دسمبر)۔ اردو میڈیم پرائمری اسکول مٹ پلی میں 82 طلبہ (جماعتِ اول تا جماعت پنجم) کے لیے صرف ایک اردو میڈیم ٹیچر ہے جب کہ یہاں کے ایک اور ٹیچر کو دوسرے مقام پر منتقل کیا گیا ہے اور ان کی جگہ پر تلگو میڈیم ٹیچر کا تقرر کیا گیا ہے۔ صرف ایک اردو میڈیم ٹیچر 82 طلبہ کے ساتھ کیسے انصاف کرسکتا ہے؟ اس خصوص میں طلبہ کے سرپرستوں نے متعلقہ عہدیداران ایم ای او مٹ پلی ایم. چندر شیکھر اور ڈی ای او کے. راملو سے مطالبہ کیا کہ وہ اردو میڈیم اسکولوں بہ شمول اردو میڈیم پرائمری اسکول مٹ پلی میں اردو میڈیم اساتذہ کا تقرر کرتے ہوئے اردو والوں کے ساتھ انصاف کریں ورنہ اردو طلبہ کا خاصا نقصان ہوگا۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام اردو، فارسی کلاسز کی اسناد تقسیم

نئی دہلی (پریس ریلیز، 19 نومبر)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام اردو، فارسی کلاسز مئی تا جون 2024 کا بیچ 31 اکتوبر کو مکمل ہوا۔ امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کے لیے تقسیم اسناد کا پروگرام ایوان غالب میں 18 نومبر کو 3 بجے سہ پہر منعقد کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ عالمی سمینار کا بھی اہتمام کرتا ہے جس سے وہ لوگ استفادہ کرتے ہیں جو اعلا تعلیم سے وابستہ ہیں لیکن بنیادی تعلیم کے لیے بھی یہ ادارہ عملی اقدام کرتا ہے جس کے گواہ آپ سب حضرات ہیں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے جب دیکھتا ہوں کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ یہاں کے آن لائن کلاسز سے وابستہ ہیں۔ ہمالیہ ڈرگس گروپ کے چیئرمین جناب سیّد فاروق نے اس اجلاس میں بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ زبان قدرت کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے اسے معمولی سمجھنا بڑی غلطی ہوگی۔ ایک ہی لفظ کی ادائیگی سے آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بات کرنے والا کس قسم کے معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ جن بچوں نے کامیابی حاصل کی انھیں میں مبارکباد دیتا ہوں اور جو اس بار کامیاب نہیں ہو سکے مجھے امید ہے کہ وہ آئندہ نمایاں کامیابی حاصل کریں گے۔ این. آئی. او. ایس. کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

شبیر شاد

سہارن پور۔ اردو کے مشہور و ممتاز صحافی اور شاعر شبیر شاد یکم جنوری 2025 کو حرکتِ قلب بند ہونے سے اچانک انتقال کر گئے۔ انھیں ان کے آبائی قبرستان قطب شیر والے سہارن پور میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اطلاع کے مطابق صبح تقریباً دس بجے مرحوم کے سینے میں درد کی شکایت ہونے پر انھیں ڈاکٹر محمد کلیم کے یہاں داخل کرایا گیا، لیکن ان کی تشویش ناک حالت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں نے انھیں تاراوتی اسپتال ریفر کر دیا تھا، جہاں دورانِ علاج ان کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر 66 برس تھی۔ ان کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ عشاء کی نماز کے بعد ادا کی گئی۔ شبیر شاد نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ اسکول میں حاصل کی۔ وہ نہایت متحرک اور سرگرم صحافیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ صحافت کے ساتھ ساتھ وہ اردو ادب سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے اور شعر و شاعری کے باعث اردو محفلوں کی رونق ہوا کرتے تھے۔ وہ تقریباً چالیس برسوں سے اردو صحافت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہے تھے۔ متعدد قومی روزناموں میں ان کی خدمات کو یاد رکھا جائے گا۔ وہ گذشتہ بارہ برس سے روزنامہ 'انقلاب' سے منسلک تھے۔ مرحوم نے سہارن پور میں رہ کر ملکی سطح پر ادب و صحافت میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ شبیر شاد کا انتقال یقینی طور پر صرف ضلع سہارن پور بلکہ اردو ادب و صحافت کا ایک بڑا نقصان ہے۔ وہ اردو پریس کلب سہارن پور کے جنرل سکریٹری اور ضلع پریس کلب سہارن پور کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ وہ متعدد ادبی، صحافتی اور سماجی تنظیموں سے بھی وابستہ تھے۔

ابوالخیر احمد

اعظم گڑھ۔ اردو کے معروف صحافی ابوالخیر احمد کا یکم جنوری 2025 کو انتقال ہوگیا۔ بعد نمازِ عصر آبائی گاؤں نیاؤج میں ہزاروں سوگواروں کے بیچ مرحوم کو سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کی نمازِ جنازہ وسیم احمد نے پڑھائی۔ واضح ہو کہ جناب ابوالخیر احمد کا بدھ کی صبح لکھنؤ میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ ان کی صحت گذشتہ کئی برسوں سے متاثر چل رہی تھی مگر حسبِ معمول وہ اپنا کام کر رہے تھے۔ دو روز قبل طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اہلِ خانہ لکھنؤ لے گئے جہاں علاج کے دوران 65 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی پوری زندگی صحافت کے میدان میں گزری۔ وہ ایک نڈر اور بے خوف صحافی تھے۔ 'آوازِ ملک' سے انھوں نے صحافت کا آغاز کیا تھا اور زندگی کی آخری سانس تک صحافت سے وابستہ رہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **نقشِ تحریر**
مصنف : واجداختر صدیقی
ضخامت : 312 صفحات
قیمت : 400روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : سعیداختر اعظمی

E-mail: sakhtar0075@gmail.com

سرزمینِ گلبرگہ ادبی حوالے سے زرخیز رہی ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے لے کرتا حال اہلِ علم وادب کا طویل سلسلہ ہے جنھوں نے اردوزبان کو مالامال کیا۔ یہیں کے ہونہارسپوت واجداختر صدیقی بھی ہیں جنھوں نے تدریس کے شانہ بہ شانہ شعر و ادب کے گیسو سنوارنے کا عزم محکم کیا ہے۔ وہ گلبرگہ کے قلم کاروں کو شناخت دلانے اور قاریوں کے وسیع حلقے تک پہنچانے کے لیے کوشاں رہے ہیں، اسی لیے وہ گاہے گاہے نثرونظم کے میدان میں سرگرم رہنے والوں کی تحریروں پرخامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ اپنی حالیہ تصنیف 'نقشِ تحریر' میں انھوں نے اُن ادبی قمقموں کو یکجا کردیا ہے جو ادبی روشنی بکھیرنے کے عمل میں سرگرم ہیں۔

'نقشِ تحریر' تین درجن سے زائد قلم کاروں کے فکروفن کا اعترافیہ ہے جسے 8 معنی خیز ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بابِ اول 'بابِ زماں' میں شامل مضمون 'گلبرگہ کی نثری تصانیف : ایک جائزہ' طویل عہد کی ادبی تاریخ کا اشاریہ ہے جس میں قبل آزادی و مابعد آزادی نثرونظم نگاران کے فن سے متعارف کرایا گیا ہے۔ بابِ دوم 'بابِ سخن' حمید سہروردی، خمار قریشی، تنہا تماپوری، حامد اکمل، نصیر احمد نصیر، اکرم نقاش، رزاق اثر، جوہر تماپوری، سعید عارف، عبدالستار خاطر، محمد یوسف شیخ، ڈاکٹر سید عتیق اجمل وزیر، نور فاطمہ انصاری، ڈاکٹر رفیق سوداگر، رفعت آسیہ شاہین اور محمد جاوید اقبال صدیقی کی شعری کائنات کے لیے مختص ہے۔ بابِ سوم 'بابِ فن' ریاض قاصدار، منظوروقار، ڈاکٹر وحید انجم، حنیف قمر اور محمد عرفان ثمین کے فکشن اور ڈاکٹر غضنفر اقبال کے فنِ انٹرویو کا احاطہ کرتا ہے۔ بابِ چہارم 'بابِ ایوان' میں ڈاکٹر وہاب عندلیب، عبدالرحیم آرزو، رشید جاوید، حمید سہروردی، خالد سعید، وحید انجم، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، ڈاکٹر انیس صدیقی، پروفیسر حامد اشرف، ڈاکٹر محمد منظور احمد دکنی اور ڈاکٹر غضنفر اقبال کی خاکہ نگاری، سخن وری، نظم ونثر، نصابی تدوین، تحقیق وتنقید، تعلیمی مضامین اور نثر نگاری کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

بابِ پنجم 'بابِ جہان' میں ڈاکٹر وحید انجم (زخموں کی زبان، منظر دھواں دھواں) اور ڈاکٹر غضنفر اقبال (کلام تجھ لب کا) کے شعری مجموعوں پہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ بابِ ششم 'بابِ چمن' ہنستی مسکراتی تحریروں پہ مبنی کتب 'بہرکیف' (ڈاکٹر حلیمہ فردوس) 'جستہ برجستہ' (امجد علی فیض) اور 'مسکرانا منع ہے' (منظوروقار) کا مختصر اور تفصیلی تبصرہ ہے۔ بابِ ہفتم 'بابِ میزان' بھی تبصرے اور جائزے کے لیے مخصوص ہے جس میں متنوع موضوعات کی شمولیت ہے۔ ڈاکٹر جلیل تنویر کی 'فکرونظر' کی بعض تنقیدی تحریریں جامع ہیں تو بعض میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اکرم نقاش اور ڈاکٹر انیس صدیقی کی مرتب کردہ 'افلاک' میں ماقبل آزادی و مابعد آزادی گلبرگہ کے شعراونثرنگاروں کا اشاریہ تیار کرنے کے شانہ بہ شانہ پندرہ جدیدیت پرست شعرا کے فن کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ 'کرناٹک کے اردو قلم کاروں کی ڈائریکٹری' ڈاکٹر انیس صدیقی کا کارنامہ ہے جنھوں نے یہاں کے 242 قلم کاروں کے سوانحی کوائف یکجا کردیے ہیں۔ اکرم نقاش کے 'خانہ تکلم' میں اردوادب کے گیارہ فن کاروں (شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، فضیل جعفری، خلیل مامون، وارث علوی، محمد علوی، ندا فاضلی، بشر نواز، بلراج کومل، اکرام باگ، خالد جاوید) کے انٹرویوز شامل ہیں۔ پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر کا 'مولانا محمد انواراللہ فاروقی: شخصیت اور کارنامے' محقق وادیب کے حالات زندگی کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال کا 'تری بات پیاری لگے' مختلف اصحابِ قلم کے لکھے ہوئے خاکوں کی یکجائی ہے۔ 'ڈاکٹر شکیب انصاری: حیات اور ادبی خدمات' بھی غضنفر اقبال کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ نور فاطمہ انصاری کی 'آبگینے' خواتین کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ہیں۔ اظہر جمال کی 'ڈاکٹر انیس صدیقی: گل شگفتہ رو، سنگلاخ راہوں کو ہموار کرنے کا ہنر رکھنے والے قلم کار و محقق کے فکروفن کا اعتراف ہے۔ مولانا حافظ وقاری محمد فخرالدین مانیال کی 'سیرت تاج المشائخ' میں ان کی شخصیت کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بابِ ہشتم 'بابِ گمان' شاہد فریدی کے افسانے 'زن گزیدہ' اور حسن محمود کے افسانے 'آئینہ' کی پیش کش اور اس کا تجزیہ ہے۔

بلاشبہ یہ اہم کتاب ہے لیکن دو باتیں دورانِ مطالعہ کھٹکتی ہیں۔ اول: غیرفصیح فقرے، دوم: خطابیہ آہنگ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- کس قدر آباد گھر تھا آج اچانک خالی ہوگیا (ص 47، اس مصرعے میں 'اچانک' لفظ زیادہ ہے جو دیگر مصرعوں کے وزن سے الگ ہوجاتا ہے)
- ان کی غزلوں کا مجموعہ ان کے بیاض میں کافی ہے جسے 2013 میں 'کہکشاں' کے نام سے ان کی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا گیا۔ (ص 56 یہاں 'ان کی غزلوں کا مجموعہ' زائد ہے)
- 'سہمے سہمے جل تھے کچھ دیے' (ص 63 اور 64 یہاں 'جل' اور 'تھے' کے درمیان 'رہے' ہوگا)
- 'ایک خطرہ بھی سمندر میں نہ تھا' (ص 69 یہاں 'خطرہ' نہیں 'قطرہ' ہوگا)
- 'سحر پسند ہے قلم کار، رات کاٹے گا' (ص 81 یہاں 'ہے' زائد ہے)
- 'مرحوم رشید جاوید اس محلّہ کی آن بان اور شان تھے جنھوں نے اردو ذریعۂ تعلیم کے ذریعے غریب طلبہ کو علم کے زیور سے آراستہ کرتے رہے (ص 95 یہاں 'جنھوں نے اردو ذریعۂ تعلیم کے ذریعہ' کے بجائے 'جو اردو ذریعۂ تعلیم کے توسط سے' ہوگا)
- 'عبدالستار خاطر جن کی کتاب 'خیابانِ خاطر' منظرعام پر آکر مقبول ہوچکی ہے۔ عبدالستار خاطر ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ عبدالستار خاطر گوشہ نشین اور تنہائی پسند آدمی تھے (ص 101 یہاں اسم 'عبدالستار' تین بار آیا ہے۔ پہلی بار یہ ضروری تھا دوسری اور تیسری بار یہاں ضمیر کا استعمال کرنا چاہیے تھا۔ درست جملہ یوں ہوگا: 'وہ ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ گوشہ نشین اور تنہائی پسند آدمی بھی تھے)
- طنزومزاح نگاری کے میدان میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لایا ہے (ص 140 یہاں درست جملہ یوں ہوگا: 'طنزومزاح نگاری کے میدان میں وہ اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لانے میں کامیاب ہوئے')
- 'کتاب 'ہوا محل' میں شامل 13 کہانیاں سماج ومعاشرے میں پھیلی ہوئی 13 برائیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں' (ص 144۔ 'سماج و معاشرہ' یہ دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ یہاں صرف 'سماج' کافی ہے۔ دوسری بار 'عدد' لانے کی ضرورت نہیں۔ 'الگ الگ' لکھنے سے بات بن جائے گی۔
- 'کہانی کے قارئین وسامعین' (ص 146، یہاں 'قارئین' کافی ہے، کیوں کہ کتاب کے قارئین ہی ہوتے ہیں 'سامعین' نہیں۔
- 'سامع یا قاری ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد چونکتا ہے' (ص 148 پڑھنے والا 'قاری' کہلاتا ہے 'سامع' نہیں۔ یہاں 'سامع' زائد ہے)
- 'مناظر عاشق ہرگانوی نے ماہنامہ شاعر' (ص 150، یہاں 'نے' زائد ہے)
- 'حنیف قمر کے افسانچے' ص 152 پہلے پیراگراف کے تخاطب کا اختتامی جملہ 'خوبیاں رکھتا ہے'، رواں دواں رکھتا ہے، دیکھا ہے، اس نے' جس ڈھب میں ہے وہ ص 153 اور 154 میں یکسر تبدیل ہوجاتا ہے۔ 'باشندے ہیں، ممبئی میں ہیں، انھوں نے، متلون مزاج ہیں'۔ بے تکلفی اور تکلف، ان میں کسی ایک کو ہی پوری تحریر میں رکھنا چاہیے تھا۔

خطابیہ آہنگ 'علامتی پیکرسازی کا نمونہ: نصیر احمد ناصر'، 'اکرم نقاش کی غزل گوئی'، 'سچے جذبوں کا شاعر: عبدالستار خاطر' میں بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ بعض تحریریں اس قدر مختصر ہیں کہ ان پہ رپورٹ یا خانہ پُری کا گمان ہوتا ہے۔ دیگر تحریروں کی طرح ان میں بھی تکمیلی عناصر ہونے چاہیے تھے۔ ماحصل یہ ہے کہ گلبرگہ کے قلم کاروں پر لکھی گئی یہ تحریریں ان کے فکروفن کا بھرپور تعارف کراتی ہیں۔ دیگر علاقہ جات کے ادبا وشعرا پر بھی ایسا ہی بھرپور کام سامنے آنا چاہیے۔

◆◆◆

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سراُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-
سیرالمنازل (مرزا سنگین بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
محرابِ تمنا	فطرت انصاری	200/-
مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر...	میر حسین علی امام، یاسمین سلطانہ فاروقی	700/-
لفظ (کلیاتِ زہرا نگاہ)	زہرا نگاہ	500/-
In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman)	ترجمہ: بیدار بخت	500/-
سخنِ افتخار (کلیاتِ افتخار عارف)	افتخار عارف	1500/-
گواہی (شاعری)	گوہر رضا	500/-
میری زمین کی دھوپ (ہندی)	ونود کمار ترپاٹھی بشر	400/-

بقیہ: سہ ماہی 'اردو ادب' کا میر تقی میرؔ نمبر: ایک مطالعہ

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

تحریریں انگریزی سے اردو میں نریش ندیم صاحب نے ترجمہ کی ہیں اور ان کی نہایت مہارت کے ساتھ ایڈیٹنگ ڈاکٹر صدف فاطمہ نے کی ہے۔

شمارے میں شامل مضامین کی فہرست اور ان کے موضوعات میرؔ کی زندگی اور شاعری کے تمام ضروری پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں فارسی کے سب سے محترم اسکولر پروفیسر شریف حسین قاسمی کا مضمون 'میر تقی میرؔ کی دہلی (منظوم و منثور فارسی آثار کی روشنی میں)' میرؔ کی دہلی اور شاہ جہان آباد کے ادبی منظرنامے کو میرؔ کی فارسی شاعری کے تناظر میں پیش کرتا ہے جو اس دور کی گنگا جمنی تہذیب کو سمجھنے میں ایک ایسے وقت میں مددگار ہوگا جب اس گنگا جمنی تصور کے گروہی خطرات منڈلا رہے ہیں۔

'میر کے چند محاوراتی اشعار' میں ڈاکٹر بیدار بخت نے میرؔ کے محاوراتی اشعار کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کے اسلوب کے اثر، نزاکت اور معنوی گہرائی کو روشن کیا ہے۔ اس مضمون سے میرؔ کے اشعار کی فلسفیانہ اور ادبی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ 'میر تقی میرؔ: تازہ تحقیقات و انکشافات' میں پروفیسر معین الدین عقیل نے میرؔ پر ہونے والی جدید تحقیقات کو پیش کرتے ہوئے اہم انکشافات کیے ہیں۔ ان کی تحریر تحقیقی نوعیت کی ہے اور نئے قاری کے لیے میر کے مطالعے کو دل چسپ بناتی ہے۔

'میر کی فارسی شاعری (اختصاص و امتیاز)' میں پروفیسر اخلاق آہن نے میرؔ کی فارسی شاعری کے اختصاص اور امتیاز کو بیان کیا ہے۔ ان کا مضمون اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ میرؔ صرف اردو ہی کے شاعر نہیں تھے بلکہ فارسی ادب میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ 'آب حیات اور میرؔ' میں ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے 'آب حیات' میں میرؔ کی تصویر کشی پر تنقید تو کی ہے مگر اس کتاب کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھنے پر زور دیا۔ خالد ندیم کا مضمون 'تلمیحاتِ میر: انبیائے کرام کے حوالے سے' میں میرؔ کی شاعری میں مذہبی حوالہ جات اور تلمیحات کے استعمال کو گہرائی سے بیان کرتا ہے۔ یہ مضمون میرؔ کی فکری وسعت اور ان کے ادبی ورثے کی اہمیت کو مزید نمایاں کرتا ہے۔

'قندِ مکرر' کے عنوان کے تحت پروفیسر ارجمند آرا کا ترجمہ کردہ رالف رسل کا مضمون 'میرؔ: ایک شخص اور اس کا عہد' اور علی سردار جعفری کے 'کلیاتِ میر کا دیباچہ' ایک بار پھر شائع کرنا شمارے کی اہمیت میں قابلِ قدر اضافہ کرتا ہے۔ یہ تحریریں میرؔ کی شخصیت اور ان کے عہد کو بہتر سمجھنے میں معاون ہیں۔

پروفیسر ارجمند آرا کا ہی مضمون 'کلاسیکی غزل پڑھنے سے پہلے' نئے قارئین کے لیے نہایت اہم ہے۔ میرؔ کے اشعار کو سمجھنے کے لیے دیے گئے نکات نہایت مفید ہیں اور ان کی شاعری کے پس منظر کو واضح کرتے ہیں۔ اس مضمون سے قبل ڈاکٹر اطہر فاروقی کا وضاحتی نوٹ بعنوان 'دیوانِ میر ناگری میں: کہانی ایک نہایت شاطرانہ سرقے کی' نے دیوانِ میرؔ کی تدوین اور اشاعت کے مسائل کے اس سلگتے ہوئے سوال کو اٹھایا ہے جو اردو شاعری کی ناگری میں اشاعت کے متعلق ہے۔ اردو سے ہندی ترجمے کو لوگ دنیا کا سب سے آسان کام نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ اسے مشینی انداز میں کرتے بھی ہیں، جو اردو ادب کے لیے نیک فال قطعی نہیں ہے۔ پروفیسر ارجمند آرا اپنے ایسے ہی ایک شاگرد و پن گرگ کی بدنیتی کا شکار ہوگئیں۔ ان کے اس شاگرد کا خیال تھا کہ ایک اردو اور ناگری جاننے والے ٹائپسٹ کے ذریعے میرؔ کی شاعری کو اردو سے ناگری لپی میں منتقل کرنا نہایت آسان کام ہے۔ ارجمند آرا صاحبہ نے اس متن کو ناگری میں ازسرِ نو مرتب کیا مگر ان کے شاگرد نے اس کتاب کو 'چلو ٹک میر کو سننے' کے عنوان سے راج کمل پرکاشن سے صرف اپنے نام سے شائع کرالیا۔

محمود احمد کاوش کا مضمون 'میر تقی میرؔ کا غیر مطبوعہ دیوانِ ہفتم' میں میر کے متنازع غیر مطبوعہ 'دیوان ہفتم' کے حوالے سے کی گئی تنقید مضمون نگار کی علمی گہرائی اور باریک بینی کا مظہر ہے۔ پروفیسر معین الدین عقیل صاحب کے مطبوعہ متن میں سیکڑوں غلطیوں کی نشاندہی اور مدون کے دعووں کی تردید نے اسے ایک غیر معمولی مضمون بنا دیا ہے۔ خاص طور پر دو غزلوں، چند اشعار، اور ایک مصرع کی بنیاد پر نئے دیوان کا دعویٰ، جسے محمود احمد کاوش نے 'فریب' یا 'لاعلمی کا شاہکار' قرار دیا، اردو تحقیق کے معیارات پر سوال اٹھاتا ہے۔ مدیر نے یہ مضمون شائع کر کے علمی اختلاف کا دروازہ ایک بار پھر کھولا ہے۔ ان کا یہ قدم نہایت جرأت مندانہ ہے اور سہ ماہی 'اردو ادب' کی علمی دیانت داری پر بھی ایسے وقت میں دلالت کرتا ہے جب اردو کے علمی پرچے ستائشِ باہمی کا کلب بن کر رہ گئے ہیں اور ان میں چوں کہ کوئی اختلافی بات مصلحتاً شائع نہیں کی جاتی، اس لیے، قاری کی ان میں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

'ارمغان انجمن ترقی اردو (ہند)' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر صدف فاطمہ صاحبہ کے ترجمہ کردہ 'میر کے فارسی لطائف' کو شامل کرنا انجمن کا ایک اور جرات مندانہ قدم ہے۔ یہ ترجمہ میرؔ کی شخصیت اور فن کے ان گوشوں کو سامنے لاتا ہے جو اب تک نظر انداز کیے گئے تھے۔ یہ ترجمہ ایک قابلِ تحسین کاوش ہے۔ اس نے میرؔ کے تخلیقی پہلو کے ایک اہم گوشے کو اردو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس ترجمے کو شائع کر کے انجمن نے اپنی اس 98 سالہ غلطی کی عملی تلافی کی ہے جو مولوی عبدالحق نے اپنے نام نہاد مذہبی جوش میں کی تھی۔ ہمارے علما نے کبھی میرؔ کی شاعری پر اس لیے اعتراض نہیں کیا کہ اس میں موجود فحاشی کا بیان بیمار ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ایک زوال آمادہ معاشرہ کا آئینہ ہے جسے تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ترجمہ نہ صرف نہایت سلیس ہے بلکہ اس پر ڈاکٹر صدف فاطمہ نے جو علمی حواشی لکھے ہیں، وہ بھی بے مثال ہیں۔ اس حصے کو پڑھنے کے بعد ہی میرؔ اور بے خود دہلوی کے ان رشتوں کا پتا بھی چلتا ہے جن پر ابھی تک میرؔ کے کسی نقاد نے لکھا ہی نہیں ہے۔ صدیق الرحمان قدوائی صاحب نے اپنے اداریے میں یہ مژدہ بھی سنایا ہے کہ ڈاکٹر صدف فاطمہ صاحبہ نے 'ذکرِ میر' کے اس آخری حصے کا انگریزی ترجمہ بھی کر لیا ہے جو اس لیے بھی خوش آئند ہے کہ اس طرح اردو کو ایک ایسا مترجم مل گیا ہے جو اردو سے انگریزی اور فارسی سے اردو اور انگریزی میں نہایت عمدہ ترجمہ کر سکتا ہے۔

'میرؔ کی دلی: شاہ جہان آباد، ایک شہر ممکنات' کے عنوان کے تحت فروری 2024 میں منعقدہ انجمن کی تقریب میں میرؔ کے تخلیقی ورثے کو دہلی کی ثقافت کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس تقریب کے ساتھ دو اور تقریبات جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، کی تفصیلی رپورٹس بھی اس شمارے میں شامل ہیں، جو ان تقریبات کو ریکرڈ کا حصہ بنانے کی ایک عمدہ مثال ہونے کے ساتھ قارئین کو ان لمحات کا مشاہدہ کرنے کا موقع بھی فراہم کراتی ہیں۔

ایک بار پھر یہ بات کہنے کی ضرورت ہے کہ سہ ماہی 'اردو ادب' کا مذکورہ 'میر تقی میرؔ نمبر' انجمن ترقی اردو (ہند) کا ایک تاریخی علمی کارنامہ ہے۔ یہ شمارہ میرؔ کی زندگی، شاعری اور ان کے عہد کو نئے زاویوں سے پیش کرتے ہوئے اردو ادب میں تحقیق و تنقید کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔ شمارے میں شامل مضامین اور تراجم میرؔ کے ادبی مقام کو مزید مستحکم اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔ انجمن نے اس شمارے کے ذریعے میرؔ کے تین سو سالہ جشن کو محض رسم کی ادائیگی تک محدود نہیں رکھا بلکہ پورے ایک برس ہر ممکن طریقے سے علم و ادب کی خدمت کا عملی مظاہرہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی کی ادارت نے اس شمارے کو علمی، تحقیقی اور ادبی شاہکار میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ شمارہ نہ صرف میرؔ کے کلام کی عظمت کو روشن کرتا ہے بلکہ اردو ادب کی تحقیق اور تنقید میں نئے رجحانات کو بھی فروغ دیتا ہے جو ادب کے قارئین اور محققین کے لیے یقیناً ایک بیش قیمتی تحفہ ہے۔

ڈاکٹر شاھد حبیب

اسسٹنٹ ایڈیٹر، پبلی کشن ڈویژن، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

Mob. No. : 8539054888

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام

اردو، فارسی کلاسز کی اسناد تقسیم

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی نے اس پروگرام میں بطورِ مہمانِ اعزازی شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ میں غالب انسٹی ٹیوٹ اپنی طالبِ علمی کے زمانے سے آتا رہا ہوں۔ اس ادارے نے تنِ تنہا اردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ بنیادی تعلیم کی خدمت بھی اس ادارے کے پیشِ نظر ہے یہ امر قابلِ مبارکباد ہے۔ بنیادی تعلیم کے بغیر اعلا تعلیم کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ آن لائن کلاسز کا سلسلہ کووڈ کے زمانے میں شروع ہوا تھا اور ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ بیماری کے خاتمے کے بعد بھی یہ سلسلہ اتنی کامیابی کے ساتھ جاری رہے گا، لیکن آج مجھے بہت خوشی ہوتی ہے کہ ساری دنیا سے طلبہ اس آن لائن کلاس کا حصہ بنتے ہیں اور اپنے بہتر تاثرات سے ہمیں نوازتے ہیں۔ اردو فارسی کلاس کے استاد جناب طاہر الحسن نے کہا کہ میں نے اپنی جانب سے پوری کوشش کی ہے کہ کوئی کوتاہی نہ رہنے پائے، لیکن اگر کوئی کمی میری جانب سے رہ گئی ہو تو طلبہ مجھے اس جانب متوجہ کریں تاکہ آئندہ اس کمی کو دور کیا جا سکے۔ کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو سرٹیفکٹ تقسیم کیے گئے اور پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو بالترتیب تین ہزار، دو ہزار اور ایک ہزار روپے، سرٹیفکٹ اور میمنٹو پیش کیا گیا۔ انعام حاصل کرنے والے طلبہ کے نام اس طرح ہیں: ڈاکٹر انوراگ پرساد، جناب پرکاش دیش پانڈے (اردو پہلی پوزیشن)، محترمہ سوہا بترا (اردو دوسری پوزیشن)، جناب گرمیت سنگھ چانا (اردو تیسری پوزیشن)، محترمہ دیپا بالا سبرامنیم (فارسی پہلی پوزیشن)، محترمہ مریم (فارسی دوسری پوزیشن)، محترمہ لبیقہ اشرف (فارسی تیسری پوزیشن)۔ اس موقعے پر طاہر الحسن صاحب کی کتاب 'نورنگ اردو' اور جناب گرمیت سنگھ چانا کی کتاب 'Tamarind' کی رسمِ اجرا بھی عمل میں آئی۔

اسٹینڈرڈ

انگلش اُردو ڈکشنری

مولوی عبدالحق

قیمت: 500 روپے

سہ ماہی مجلّہ 'اردو ادب' کا میر تقی میرؔ نمبر: ایک مطالعہ

شاہد حبیب

اردو کے ہر قسم کے رسائل و جرائد کا زوال ہر چند کہ یہاں موضوع نہیں مگر یہ سوال اہم ضرور ہے کہ جب خصوصاً اردو کے ادبی پرچے تیزی سے بند ہو رہے ہیں تو آخر سہ ماہی 'اردو ادب' اپنی اشاعت کے 103 سال بعد بھی اتنی ہی آب و تاب سے کس طرح شائع ہو رہا ہے۔ مشہور صحافی خشونت سنگھ نے Illustrated Weekly of India کا مدیر بننے کے بعد اس کی تعدادِ اشاعت کو لاکھوں میں پہنچا دیا تھا۔ انھوں نے کامیاب پرچے کا یہ نسخہ اپنی خودنوشت سوانح Truth, love & a little malice an autobiography میں بتایا ہے جس پر اردو کا کوئی جریدہ پورا نہیں اترتا: Inform, Amuze and Irritate (ص 253) اردو کے ادبی پرچوں میں بعد کی دونوں خصوصیات مفقود رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف جہاں انگریزی کے بعض علمی پرچوں میں مضمون اشاعت کے لیے منظور ہونے کے بعد پانچ برس انتظار کرنا پڑتا ہے، وہیں اردو میں نوکری اور ترقی کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے والے اردو کے نام نہاد Peer Reviewed Journals کی تعدادِ اشاعت سو بھی نہیں ہے۔

'اردو ادب' کے مدیر ہمیشہ بڑے اور نہایت قابلِ احترام لوگ رہے ہیں۔ اس فہرست میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور پروفیسر آلِ احمد سرور کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مگر ڈاکٹر اطہر فاروقی صاحب کی ادارت میں اردو ادب نے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ مضامین کے موضوعات کا تنوع، بغیر کسی مصلحت کے تحریروں کا انتخاب اور پورے پرچے کی ایسی معیاری زبان جو تحریروں کے عدمِ توازن کو دور کر دے، اردو کے علمی جریدے میں اب نظر نہیں آتی۔ اردو میں تو اصل میں ایڈیٹنگ کا انگریزی جیسا تصور ہی نہیں ہے۔

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ایڈیٹنگ کا اصول یہ ہے کہ اگر مدیر ایک مضمون قاضی عبدالودود کا شائع کر رہا ہے تو باقی مضامین کی زبان کو بھی وہ ایڈیٹنگ سے تقریباً قاضی صاحب کی زبان کی سطح پر لے تو آئے گا مگر دونوں کے درمیان امتیاز قائم رہے۔

میر تقی میرؔ (1723-1810) اردو شاعری کے ان بلند پایہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھیں بجا طور پر خدائے سخن کا لقب دیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں انسانی جذبات، درد، عشق، اور فلسفۂ حیات کا جو امتزاج ملتا ہے، وہ اردو ادب میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ میرؔ کی ولادت کے تین سو سالہ جشن کے موقع پر انجمن ترقی اردو (ہند) نے پورے برس تقریبات منعقد کیں۔ پہلی تقریب 22 جنوری 2024 کو انڈیا ہیبیٹیٹ

نام رسالہ: سہ ماہی 'اردو ادب' (میر تقی میرؔ نمبر)
مدیران : صدیق الرحمٰن قدوائی، اطہر فاروقی، صدف فاطمہ
ضخامت : 320 صفحات
قیمت : 500 روپے
ناشر : انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی

سنٹر کے اشتراک سے اور دوسرا چار روزہ جشنِ میرؔ 15 سے 18 فروری 2024 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد ہوا اور آخری تقریب 29 ستمبر کو انگریزی کے مشہور شاعر رنجیت ہوسکوٹے کے 150 اشعار پر مبنی The Homeland's an Ocean پر انڈیا ہیبیٹیٹ سنٹر ہی میں منعقد کی گئی۔ ان تینوں ہی تقریبات میں اردو کی اصطلاحی دنیا سے باہر میر کے شائقین کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ کسی بڑے شاعر کے جشن کی اکثر تقریبات رسمی یا خانہ پُری کی حد تک محدود رہتی ہیں، لیکن انجمن نے اس روایت سے ہٹ کر میر کے تعلق سے جو کام انجام دیا، وہ میرؔ کے مطالعات کے فکری اور تحقیقی میدان میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ جشنِ میرؔ کا اختتام سہ ماہی مجلّے 'اردو ادب' کے خاص شمارے میر تقی میر نمبر، جلد 69-68، شمارہ نمبر 74-270 پر کیا گیا ہے، جو میرؔ کے ادبی مقام کو روشن کرنے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔ یہ شمارہ میرؔ کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی ایک عہد ساز کوشش ان معنی میں بھی ہے کہ میرؔ پر لکھی جانے والی تحریروں میں اب جو یکسانیت اور اوبا دینے والے چند ہی نکات کی تکرار ہوتی ہے، یہ شمارہ اس سے برات کی کوشش ہے۔ اس شمارے کا ہر مضمون میرؔ کی زندگی اور کلام کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

'اردو ادب' کے میر تقی میرؔ نمبر میں نہ صرف میرؔ کے فکر و فن پر سنجیدہ اور گہرائی سے کی گئی تحقیق پیش کی گئی ہے بلکہ اس کے ذریعے میرؔ کو عالمی تناظر میں متعارف کرانے کی بھی بے مثال کوشش اس شمارے کا خاصہ ہے۔ جریدے کے مدیر ڈاکٹر اطہر فاروقی کا اس خاص شمارے کو انفرادی اور تحقیقی مواد سے مزین کرنے میں فیصلہ کن کردار ہے۔ اس شمارے میں شامل مضامین، تراجم، اور مباحثِ میرؔ کے تخلیقی، فکری اور تہذیبی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ شمارہ اس بات کا بھی مظہر ہے کہ کس طرح ایک مدیر اپنی بصیرت، محنت اور علمی ذوق سے ایک ادبی مجلّے کو اتنے اعلا معیار پر اور وہ بھی ایسے وقت میں پہنچا سکتا ہے جب اردو کے علمی جریدے تیزی کے ساتھ بند ہو رہے ہیں، اور جو جاری ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے جب کہ 'اردو ادب' علمی و ادبی مجلّہ ہوتے ہوئے بھی بڑی تعداد میں فروخت ہوتا ہے اور اسے امیزون کے ذریعے خریدا جا سکتا ہے۔

اطہر فاروقی صاحب نے اس شمارے کی وساطت سے نہ صرف میرؔ کے علمی اور ادبی پہلوؤں کو ایک نئے اور معروضی انداز میں پیش کیا ہے بلکہ میرؔ کی شاعری کی عصری معنویت اور بین الاقوامی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ شمارے میں شامل مختلف النوع موضوعات نہ صرف میرؔ کے کلام کو مختلف زاویوں سے سمجھنے میں معاون ہوں گے بلکہ ادب کے طلبہ اور محققین کے لیے یہ شمارہ نئے امکانات بھی پیش کرتا ہے۔

اس خصوصی شمارے کا اداریہ انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تحریر کیا ہے، جس میں انھوں نے میرؔ پر سنجیدہ اور معیاری کام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کے خیالات اس بات کا واضح اشارہ دیتے ہیں کہ اب میرؔ کی شاعری اور ان کی شخصیت کے مطالعے میں گہرائی اور وسعت دونوں کا مکمل فقدان ہے۔ اپنے اداریے میں انھوں نے میرؔ کی شاعری کو ان کے عہد کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرؔ کی شخصیت اور کلام کے حوالے سے تحقیق کے نئے دروازے کھولنے کی ضرورت ہے۔ اداریے میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ میرؔ کا مطالعہ ان کے فارسی کلام کے بغیر نامکمل ہے۔ اس بات کو شمارے میں شامل مضامین کی ترتیب اور تنوع سے بخوبی تقویت ملتی ہے۔ قدوائی صاحب کا یہ اداریہ 'اردو ادب' کے اس خصوصی شمارے کی علمی سمت کو بھی متعین کرتا ہے۔ انھوں نے نہایت بصیرت افروز انداز میں میرؔ پر سنجیدہ تحقیقی کام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کے مطابق، میرؔ کا مطالعہ صرف ان کے کلام تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کی شاعری کے ذریعے ان کے عہد، ثقافت اور انسانی جذبات کی تفہیم بھی ضروری ہے۔

میرؔ کے عالمی تناظر میں تعارف کے لیے انگریزی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر رنجیت ہوسکوٹے کے قلم سے کیے گئے میرؔ کے 150 اشعار کا ترجمہ The Homeland's an Ocean قابلِ ذکر ہے۔ شمارے میں شامل 'گوشہ ہوسکوٹے' کے تحت ان کی تقریر بعنوان 'میر کی راہ پر' اور سلمان خورشید صاحب کے ساتھ گفتگو میرؔ کے تخلیقی عمل اور ان کے تہذیبی و ثقافتی اثرات کی تفہیم کے نئے امکانات روشن کرے گی۔ یہ گوشہ میرؔ کی شاعری کی بین الاقوامی اہمیت کو نمایاں کرتے ہوئے یہ بتاتا ہے کہ میرؔ کا کلام نہ صرف اردو دنیا میں بلکہ دیگر زبانوں اور ثقافتوں پر بھی گہرا اثر رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے رنجیت ہوسکوٹے جیسا انگریزی کا بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر انجمن ترقی اردو (ہند) کی دعوت پر میرؔ پر گفتگو کے لیے دلّی آیا۔ یہ دونوں ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***